عربی زبان کا تعارف

اور اس کا ارتقاء

تمہید:

عربی زبان ایک بڑی عالمی زبان ہے، جو کرۂ ارض کے ایک بڑے حصے میں بولی جاتی ہے۔ یہ زبان اپنی مختلف النوع اہمیت کے پیش نظر دنیا کی زبانوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ دنیا کے کروڑوں لوگ اس زبان کو بولتے ہیں اور ایک ارب سے زائد لوگوں کے نزدیک یہ زبان دینی حیثیت سے قابل احترام ہے۔

گزشتہ اکائی میں ہم زبان کی تعریف، اس کی اہمیت وضرورت اور سامی زبانوں کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ اس اکائی میں ہم سب سے اہم سامی زبان یعنی عربی کے بارے میں قدرے تفصیل سے پڑھیں گے۔ اس زبان کے ارتقاء کا ہمہ جہتی مطالعہ کریں گے، اس پر قرآن وحدیث کے اثرات کا جائزہ لیں گے اور اس کے مصادر پر نظر ڈالیں گے، تاکہ اس اہم عالمی زبان سے کماحقہ متعارف ہوسکیں۔

عربی زبان کا تعارف:

عربی زبان سامی زبانوں میں سب سے بڑی زبان ہے۔ یہ زبان دنیا کی اہم زبانوں میں سے ایک ہے۔ اور ایک بہت بڑے خطے میں بولی جاتی ہے۔ لگ بھگ 450 ملین یا 45 کروڑ لوگ اس زبان کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ زبان جزیرۂ نما عرب، عراق، شام اور شمالی افریقہ میں بولی جاتی ہے۔ یہ سارا علاقہ وطن عربی کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس میں بائیس (22) ملک شامل ہیں۔ اس علاقے سے متصل بعض دوسرے علاقوں میں بھی یہ زبان بڑے پیمانے پر بولی اور سمجھی جاتی ہے جیسے اہواز، ترکی، چاڈ، مالی اور سینیگال وغیرہ۔

مسلمانوں کی مذہبی زبان ہونے کی حیثیت سے عربی زبان کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس حیثیت سے دنیا کے ایک ارب سے زائد مسلمان اسے اپنی عبادات میں استعمال کرتے ہیں۔ عربی زبان مسلمانوں کے قانون سازی کے دو اہم ترین مصدر یعنی قرآن و سنت کی بھی زبان ہے۔ اس کے علاوہ عرب ملکوں میں واقع اکثر کلیساؤں کی مذہبی رسمیں بھی عربی ہی میں ادا کی جاتی ہیں۔ عصور وسطی میں یہودیوں کی بہت سے دینی اور فکری کتابیں بھی اسی زبان میں لکھی گئی ہیں۔

اسلام کے ساتھ اس زبان کے تعلق نے اس کے انتشار میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ چنانچہ ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے جن علاقوں میں اسلام پھیلا وہاں عربی زبان بھی پہنچی۔ صدیوں تک یہ زبان ادب، تہذیب، سیاست اور علوم وفنون کی زبان بنی رہی۔

عراق، شام اور اندلس کے عربی تعلیمی اداروں سے مشرق و مغرب کے بے شمار تشنگان معرفت نے اپنی پیاس بجھائی۔ غرناطہ اور قرطبہ کی دانش گاہوں سے یورپ میں علم کی روشنی پھیلی۔ ان عربی یونیورسٹیوں میں یورپ سے آنے والے طلبہ میں کلیساؤں کے پادری اور شاہی خاندانوں کے افراد بھی شامل ہوتے تھے۔ انہیں عربی اداروں کے فارغین نے یورپ میں نشأۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔

عربی زبان بائیس عرب ملکوں کی سرکاری زبان ہے اس کے علاوہ بہت سے ملکوں میں اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے جیسے سینگال، مالی، چاڈ، اریٹیریا اور اسرائیل وغیرہ۔ عرب ملکوں میں تیل کے چشمے برآمد ہونے کے بعد اس زبان کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ آج دنیا کی تمام اہم جامعات (یونیورسٹیز) میں عربی زبان کی تدریس ہوتی ہے۔

عربی زبان نے دنیا کی متعدد زبانوں پر بلاواسطہ یا بالواسطہ اثر ڈالا ہے مسلمانوں کے ذریعے بولی جانے والی تمام زبانوں پر عربی کا گہرا اثر ملتا ہے جیسے سواحیلی، ھوسہ، ترکی، کردی، فارسی، پشتو، اردو، بنگلہ اور ملایو وغیرہ۔ برصغیر کی زبانوں پر بھی عربی زبان کے اثر کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

عربی زبان 28 حروف اور تین حرکتوں: ضمہ، فتحہ اور کسرہ پر مشتمل ہے، یہ زبان دوسری سامی زبانوں کی طرح داہنی طرف سے اور اوپر سے نیچے کی جانب لکھی جاتی ہے۔ یہ اقوام متحدہ کی چھ معتمدہ زبانوں میں بھی شامل ہے۔

عربی زبان ایک سامی زبان ہے۔ اور جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ سامی زبان افرو۔ ایشائی یا سامی۔ حامی زبانوں کے خاندان کا ایک بڑا مجموعہ ہے جس میں بہت سی زبانیں شامل ہیں انہیں میں سے ایک عربی بھی ہے۔ علماء لسانیات سامی زبان کو دو بڑے گروہ میں تقسیم کرتے ہیں: شمالی اور جنوبی۔ جنوبی گروہ میں دو مجموعے ہیں۔ حبشی اور عربی، پھر عربی مجموعے کی دو شاخیں ہیں: شمالی اور جنوبی۔ عربی زبان کا تعلق اسی شمالی شاخ سے ہے۔ اس پورے مجموعے کو عربی کہنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کا تعلق جزیرہ نما عرب سے ہے، ورنہ جنوبی شاخ کی زبانیں عربی نہیں ہیں۔

علمائے لسانیات نے شمالی شاخ کو دو قسم میں تقسیم کیا ہے، ان میں سے ایک قسم کو "العربية البائدة" یعنی مٹ جانے والی عربی زبانیں کہا جاتا ہے، جبکہ دوسری قسم کا نام "العربية الباقية" یعنی باقی رہنے والی عربی زبان ہے۔ مؤخر الذکر میں اس کے مختلف لہجات بھی شامل ہیں۔ "العربية البائدة" میں ان قبیلوں کی زبانیں شامل تھیں جو حجاز کے شمال میں شام کی سرحدوں کے قریب رہتے تھے چونکہ یہ قبائل عربی زبان کے اصل مرکز یعنی حجاز اور نجد سے دور اور آرامی زبان کے علاقوں سے قریب رہتے تھے، لہذا یہ زبانیں آرامی کے رنگ میں رنگ گئی تھیں۔

یہ زبانیں بولنے والے قبائل اسلام آنے سے پہلے ہی مٹ چکے تھے۔ ان میں سے بعض کی ہلاکت کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کی زبانیں بھی مٹ گئیں۔ ہم تک ان زبانوں کے کچھ نقوش پہنچے ہیں جو ان علاقوں سے دستیاب ہوئے ہیں جہاں یہ زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اس لیے ان کو "عربية النقوش" یعنی نقوش والی عربی زبانیں بھی کہتے ہیں۔

شمالی شاخ کی دوسری قسم یعنی "العربية الباقية" ہی آج کی عربی زبان ہے اور عربی زبان سے اب یہی زبان مقصود و مراد ہوتی

ہے۔

عربی زبان کا آغاز اور ارتقاء:

آغاز:

عربی زبان کے آغاز کے بارے میں بہت سی روایتیں ملتی ہیں۔ان میں سے ایک روایت کے مطابق یعرب نام کا ایک شخص تھا جس نے سب سے پہلے اس زبان میں گفتگو کی چنانچہ اسی کے نام پر اس زبان کا نام عربی ہو گیا۔ایک دوسری روایت میں ہے کہ سب سے پہلے اس زبان کو اسماعیل علیہ السلام نے استعمال کیا۔بعض روایتوں میں تو یہاں تک آیا ہے کہ آدم علیہ السلام کی زبان عربی تھی۔ لیکن ان روایتوں کے لیے نہ تو کوئی علمی و تاریخی ثبوت ہیں اور نہ ہی ان کی تائید میں صحیح و ثابت حدیثیں ملتی ہیں۔

اگر تاریخی شواہد اور لسانی اصول و قواعد کی روشنی میں اس زبان کے آغاز اور اس کے نشو و نما کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس زبان کے آغاز و ابتدا کے بارے میں کوئی حتمی اور یقینی بات نہیں کہی جا سکتی ہے،اور اس زبان کے ابتدائی مراحل پوری طرح سے تاریکی میں ہیں اور ہم تحقیق اور دلائل سے ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں۔اس کے بارے میں جو تھوڑے علمی حقائق ہمیں دستیاب ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جزیرہ عرب میں سامی زبانوں کے جنوبی گروہ کے عربی مجموعے کی زبانیں بولی جاتی تھیں ان میں سے جنوبی شاخ یا یمن کی زبانیں درحقیقت عربی نہیں تھی لیکن جزیرہ عرب کی مناسبت سے ایرانی اور یونانی لوگ ان تمام زبانوں کو عربی کہتے تھے اسلام آنے سے پہلے ”العربية الباقية“ کو مضر کی زبان کے نام سے جانا جاتا تھا۔اور لسانی تخمینات اور قرائن سے یہ اندازہ لگتا ہے کہ اس وقت اس کی پیدائش کو تقریباً دو ہزار سال گزر چکے تھے۔اور یہ زبان جزیرہ نما عرب کے شمالی حصوں میں استعمال ہوتی تھی جہاں شمالی شاخ یا قدیم شمالی عربی (Old North Arabian) کی دوسری زبانیں بھی بولی جاتی تھیں،جن کے بارے میں ہم جان چکے ہیں کہ یہ اپنے بولنے والوں کے ساتھ مٹ گئیں۔ان زبانوں کے مٹنے کے بعد زبانِ مضر ہی پورے شمالی علاقوں کی زبان ہو گئی۔شمال جزیرہ کی مضر زبان کی طرح جنوبی شاخ یا (Old South Arabian) میں حِمیَر زبان تھی، جو جنوبی شاخ کی تمام زبانوں پر غالب تھی۔اس طرح اسلام سے پہلے پورے جزیرہ نما عرب پر انہیں دو زبانوں یعنی شمال جزیرہ میں مُضَر اور جنوب میں حِمیَر اور ان دونوں کے مختلف لہجات کا قبضہ و اقتدار تھا۔

پانچویں صدی عیسوی سے قبل ہی مُضَر زبان بہت سی بولیوں اور لہجوں میں منقسم ہو گئی تھی۔جیسے: قریش، ربیعہ اور قضاعہ وغیرہ۔ اس زبان کے بہت قدیم آثار نہیں ملتے ہیں جن سے اس کے ابتدائی نشو و نما کا صحیح علم ہو سکے۔یہ عجیب بات ہے کہ عربی زبان سامیوں کے قدیم ترین وطن سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ سامیوں کے وطن اصلی کے بارے میں جو مختلف آراء ہیں ان میں راجح رائے یہی ہے کہ وہ نجد و حجاز کی زمین تھی اور یہی زمین عربی زبان یا مضر زبان کی جائے پیدائش بھی ہے لیکن اس کے باوجود بھی اس زبان کے آثار دوسری سامی زبانوں کے آثار کے مقابلے میں بہت کم عمر کے ہیں۔مثلاً عبرانی زبان کے آثار کا تعلق بارہویں صدی قبل مسیح سے ہے، آرامی

زبان کے آثار نویں صدی قبل مسیح کے ہیں۔ اسی طرح دوسری سامی زبانوں کے آثار ہیں۔ جبکہ عربی زبان کے قدیم ترین آثار بھی پانچویں صدی عیسوی سے پہلے کے نہیں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مٹ جانے والی عربی زبانیں جنہیں "العربیة البائدة" کہا جاتا ہے ان کے دریافت شدہ آثار بھی سامی زبانوں کے آثار کی بہ نسبت کم عمر کے ہیں اور یہ بھی صرف ایک صدی قبل مسیح تک سے تعلق رکھتے ہیں۔

بعض مغربی ماہرین لسانیات -جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں۔ شمالی شاخ کو قدیم شمالی عربی اور جنوبی شاخ کو قدیم جنوبی عربی کہتے ہیں۔ اور ہم یہ بھی جان چکے ہیں کہ عربی زبان اور اسکی تمام بولیاں شمالی شاخ یا قدیم شمالی عربی سے نکلی ہیں۔ جنوبی شاخ یا قدیم جنوبی عربی سے موجودہ عربی کو اس کے سوا کوئی تعلق نہیں ہے کہ دونوں کا تعلق جزیرہ نما عرب سے ہے اور دونوں سامی زبانیں ہیں۔ قدیم مسلمان ماہرین لسانیات اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ ابوعمرو بن علاء (متوفی 770ء) کا معروف قول ہے کہ: ''مَالِسَانُ حِمْيَر بِلِسَانِنَا وَلَاعَرَبِيَّتُهُمْ بِعَرَبِيَّتِنَا'' (نہ حمیر کی زبان ہماری زبان ہے اور نہ ان کی عربی ہماری عربی ہے)

شمالی شاخ کی مٹ جانے والی زبان (العربیۃ البائدۃ) کے جو نقوش دریافت ہوئے ہیں ان میں سے بیشتر خط مُسْنَدْ میں لکھے ہوئے ہیں، اور اس خط کا تعلق جنوبی شاخ کی زبانوں سے تھا۔ ان نقوش میں سب سے زیادہ مشہور ''نقش النمارۃ'' ہے جو دمشق کے قریب شامی صحرا سے دریافت ہوا ہے۔ یہ نقش 328ء کا تحریر کردہ ہے اور یہ اکثر نقوش کے برخلاف نبطی خط میں لکھا ہے۔ موجودہ عربی خط اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہ نقش حیرہ سلطنت کے حاکم امرؤالقیس بن عَمرو کی قبر کے کتبے سے لیا گیا ہے، جس میں اسے عرب کا بادشاہ "ملك العرب" کہا گیا ہے۔ ان نقوش میں قدیم ترین ''نقشِ عجل بن ھفعم'' ہے۔ جس کا تعلق پہلی صدی قبل مسیح سے ہے۔

ارتقاء:

شمالی شاخ کی باقی رہنے والی زبان، جسے ''العربیۃ الباقیۃ'' کہتے ہیں یہی موجودہ عربی زبان کی اصل ہے اور یہی اسلام سے قبل ایک عرصے تک زبان مُضَر کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اس زبان کا ابتدائی نشو ونما نجد و حجاز کے علاقوں میں ہوا اور جب ''العربیۃ البائدۃ'' کی زبانیں مٹ گئیں تو یہی زبان ان کے علاقوں میں بھی پھیل گئی تھی۔ چونکہ اس زبان کے قدیم تحریری یا منقوش آثار دستیاب نہیں ہیں جو ہمیں اس کے ابتدائی احوال کے بارے میں معلومات فراہم کرسکیں اس لیے ہمیں اس زبان کے ابتدائی ارتقائی مراحل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ البتہ یہ طے ہے کہ پانچویں صدی عیسوی کے شروع ہونے سے پہلے ہی یہ زبان مختلف بولیوں اور لہجوں میں تقسیم ہوچکی تھی۔

عربی زبان کے جو قدیم ترین نمونے ملتے ہیں انہیں ادب جاہلی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ تمام نمونے اور آثار قریش کے لہجے میں ہیں۔ ان آثار میں شعراء کے کلام، حکماء کے اقوال اور خطباء کی تقریریں شامل ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز پانچویں صدی عیسوی سے پہلے کی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بے حد قابل ذکر ہے کہ ان آثار میں عربی ادب اپنے پورے شباب پر نظر آتا ہے اور ظاہر ہے کہ اسے اس منزل تک پہنچنے کے لیے ارتقاء کے بہت سے مراحل طے کرنے پڑے ہونگے اور قریش کی بولی کو جس میں یہ آثار ہیں شعر و ادب کی زبان بننے میں اور ربیعہ اور قضاعہ وغیرہ کی بولیوں پر غالب آنے میں کئی ادوار سے گزرنا پڑا ہوگا۔

لہجۂ قریش کے غلبے کے اسباب:

عربی زبان ایک وسیع وعریض علاقے میں بولی جاتی تھی اور اس کے بولنے والے مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں ہر قبیلہ اپنے جغرافیائی، فطری، سماجی، تہذیبی اور فکری پس منظر میں دوسرے قبیلے سے مختلف تھا۔ اور یہ لسانیات کا مسلم قاعدہ ہے کہ کوئی زبان جو ایک وسیع علاقے میں مختلف طبقات اور قبائل کے ذریعے بولی جاتی ہے اس کی وحدت و یکسانیت کا برقرار رہنا ناممکن ہے، ایسی زبان دھیرے دھیرے مختلف لہجوں اور بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے اور عربی زبان بھی فطرت کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں رہی چنانچہ وہ بھی بہت سے لہجوں اور بولیوں میں تقسیم ہو گئی۔

لیکن مختلف بولیاں بولنے والے عربی قبائل اپنی دینی، سیاسی اور اقتصادی ضرورتوں سے ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے اور اپنی سماجی اور تہذیبی حاجتوں کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کے علاقوں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اس کے نتیجے میں ان بولیوں کا بھی باہم ملاپ ہوتا رہتا تھا اور ان میں تاثیر و تأثر کا عمل بھی چلتا رہتا تھا۔ اور زبانوں کا یہ دستور ہے کہ جب دو یا چند زبانیں یا بولیاں ملتی ہیں اور ان میں ایک عرصے تک تفاعل (Interaction) کا عمل شروع ہوتا ہے جس میں یہ آپس میں ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتی ہیں اور مآل کار ان میں سے ایک اپنی داخلی اور خارجی خصوصیات کی بنیاد پر دوسری زبانوں یا بولیوں پر غالب آ جاتی ہے اور ان سب کے درمیان مشترکہ زبان (Lingua Franca) کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ عربی بولیوں کے لسانی تفاعل اور تصادم میں قریش کی بولی کو کامیابی حاصل ہوئی اور یہی بولی تمام عربی قبائل کے درمیان معیاری بولی بن گئی اور ہر عربی خواہ وہ کسی قبیلے کا ہو، ادبی تعبیر و بیان کے لیے اسی بولی کا انتخاب کرنے لگا اور یہی بولی شعر و خطابت کی زبان بن گئی۔

لہجۂ قریش کو یہ غلبہ متعدد اسباب سے حاصل ہوا ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

1. دینی سبب:

قریش کعبۃ اللہ کے پڑوسی اور اس کے نگراں و متولی تھے اور کعبہ شریف عہد جاہلی میں بھی عرب کے بیشتر قبائل کے درمیان محترم و معظم تھا۔ عرب حج و زیارت کے لیے مکہ آتے تھے، یہیں آ کر وہ اپنی قربانیاں پیش کیا کرتے تھے، قریش ان وفود کی مہمان داری کرتے تھے اور دینی مراسم کی ادائیگی میں ان کے مدد کرتے تھے۔ اس حیثیت سے قریش کو سارے عرب میں ایک امتیازی مقام حاصل تھا اور انہیں ہر جگہ بنظر احترام دیکھا جاتا تھا۔ قریش کی اس دینی حیثیت نے ان کی بولی کو بھی ممتاز و منفرد بنا دیا تھا۔

2. اقتصادی سبب:

عرب کی تجارت کی زمام قریش کے ہاتھوں میں تھی۔ اور ان کے تجارت پورے عرب میں پھیلی ہوئی تھی۔ قبیلہ قریش کے لوگ مختلف موسم میں مختلف علاقوں کے تجارتی سفر کیا کرتے تھے۔ ان سفروں میں جاڑے میں ہونے والا یمن کا سفر اور گرمی میں ہونے والا شام کا سفر بہت مشہور تھا۔ قرآن کریم کی سورۂ ''قریش'' میں ان دونوں سفروں کا ذکر آیا ہے۔ عرب تجارت پر قریش کے اس قبضۂ و اقتدار کے سبب عربوں کی پوری معیشت پر انکا کنٹرول تھا۔ اس چیز نے قریش کو غیر معمولی اہمیت کا حامل بنا دیا تھا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ

یہ تھا کہ ان کے زبان کو بھی ایک گونہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔

3. سیاسی سبب:

دینی برتری اور اقتصادی قوت نے قریش کو پورے عرب میں ایک ممتاز سیاسی قوت بھی بنا دیا تھا۔عرب اپنے مخصوص بدویانہ مزاج اور نظام کے سبب کسی کی سیاسی برتری کو ماننے کو تیار نہیں ہوتے تھے،صرف قریش ہی ایک ایسا قبیلہ تھا جس کے سیاسی غلبۂ واقتدار کو سارا عرب تسلیم کرتا تھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب انصار مدینہ نے حکومت میں شراکت کا مطالبہ کیا تو انہیں یہ یاد کرا کر اپنے مطالبے سے دستبردار ہونے کے لیے راضی کیا گیا کہ عرب کے قبائل قریش کے سوا کسی کو بھی اپنا حاکم ماننے کے لیے تیار نہ ہونگے۔

4. لسانی سبب:

ان خارجی اسباب کے ساتھ ساتھ قریش کی بولی کو غلبہ ملنے کا ایک داخلی سبب بھی تھا،اور وہ داخلی سبب یہ تھا کہ قریش کا لہجہ اپنی لسانی خوبیوں کی وجہ سے ایک مضبوط لہجہ تھا۔ یہ لہجہ مفردات کی کثرت،اسلوب کی رقت اور مختلف قسم کی تعبیرات پر قدرت کے اعتبار سے عرب کے تمام لہجوں میں امتیازی شان اور منفرد مقام کا حامل تھا۔

یہی وہ اہم اسباب تھے جنہوں نے قریش کی بولی کو عرب کی تمام بولیوں پر فوقیت عطا کی اور اسے سارے عرب کی ادبی زبان بنادیا۔

قریشی زبان کے ترقی کے عوامل:

دوسرے تمام لہجوں پر غالب آنے کے بعد بھی قریش کی بولی یا زبان ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھتی رہی،اور مادۂ وتعبیر ہر دو اعتبار سے غنی ہوتی رہی۔ چونکہ قریش کو دینی، سیاسی اور اقتصادی حیثیتوں سے مرکزی مقام حاصل تھا لہذا انہیں مختلف بولیاں بولنے والوں سے ملنے کا خوب موقع ملتا تھا۔اور ان کی زبان ان سب بولیوں سے استفادہ کرتی رہتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زبان عربی کے مختلف لہجوں کی بہت سی خصوصیات کی جامع ہوگئی۔قریش کی اس سماجی حیثیت نے ان کی زبان کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

عرب کے قبائل میں آپسی اختلافات اور باہمی نزاعات کے لیے مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔کبھی کبھی قصہ گوئی اور پندونصائح کی محفلیں بھی سجتی تھیں۔ بین القبائلی مسائل کے حل کے لیے بھی لوگ اکٹھا ہوتے تھے۔ یونہی مختلف سماجی تقاضوں کے تحت ندوات کا انعقاد ہوتا تھا جن میں خوب بحث ومباحثے ہوتے تھے اور خطابت وزبان دانی کے جوہر دکھائے جاتے تھے۔ان سب مجلسوں، محفلوں اور ندوات کی زبان قریش کی زبان ہوتی تھی۔اس چیز نے بھی قریش کی زبان کو ارتقاء کی منزلیں طے کرنے میں مدد دی۔

عرب کے مختلف علاقوں میں بازار لگتے تھے،اور یہ بازار الگ الگ مقام پر سال بھر چلا کرتے تھے۔ان میں عکاظ کا مشہور و معروف بازار بھی شامل تھا جو موسم حج سے پہلے مکہ کے قریب لگا کرتا تھا۔ یہ عرب کا سب سے بڑا بازار تھا۔ان بازاروں میں صرف سامان تجارت کا تبادلہ نہیں ہوتا تھا بلکہ شعروادب کا بھی تبادلہ ہوتا تھا،شاعری اور تقریروں کے مقابلے ہوتے تھے۔خاندانی فضائل کے

چرچے ہوتے تھے، زبان وادب کی تعلیم ہوتی تھی، نوآموز شعراء کے کلام کی اصلاح ہوتی تھی، شعراء کے کلام پر تنقید ہوتی تھی۔ابھرتے ہوئے شعراء وخطباء کا تعارف ہوتا تھا۔اور اس طرح یہ بازار ادب وثقافت کے مراکز بھی ہوا کرتے تھے۔اور ان بازاروں میں فکروفن کے اظہار کے لیے جو زبان استعمال ہوتی تھی وہ قریش کی زبان تھی۔

قریش کی زبان نے ان بازاروں میں ارتقاء کی طویل مسافت طے کی۔اور اس زبان کو قریش کی معیاری زبان بنانے میں ان بازاروں کا بنیادی کردار رہا ہے۔

قریش کی زبان کی ترقی میں "ایام العرب" کا بھی نمایاں تعاون رہا ہے۔ایام العرب کے لفظی معنی تو ہیں: عرب کے دن یا عرب کے خاص اور اہم دن، لیکن ان سے مراد عربوں کی وہ داخلی جنگیں ہیں جو قبائل کے درمیان چلا کرتی تھیں۔عرب صحراؤں میں بستے تھے اور ان کے زندگی کا دارومدار مویشیوں پر ہوتا تھا جو ان کے سب سے بڑی دولت وثروت تھے۔ان مویشیوں کی پرورش کے لیے انہیں پانی اور گھانس کی ضرورت پڑتی تھی اور صحراء میں یہ دونوں چیزیں کم ملتی تھیں۔لہذا ہر قبیلہ پانی کے وسائل اور گھانس کے میدانوں پر قبضے کی کوشش میں لگا رہتا تھا بسا اوقات یہ کوششیں ان قبیلوں کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑکا دیا کرتی تھیں۔کبھی کبھی پڑوسی کی حمایت، عہد کی پاسداری، عزت کی حفاظت اور خاندانی بدلہ لینے کی کوشش بھی جنگ کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔اور انتہائی چھوٹی باتوں سے شروع ہونے والی یہ جنگیں طویل عرصے تک جاری رہتی تھیں۔ان جنگوں میں دَاحس وغبراء، بَسُوس، فجار اور بعاث وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

ان جنگوں میں کلام بلیغ کا استعمال بھی ہتھیاروں کی طرح ہوتا تھا۔لڑنے والے قبیلوں کے قائدین اپنے اپنے سپاہیوں میں جوش وجذبہ بھرنے کے لیے نظم ونثر میں اپنے آباء واجداد کے کارنامے سناتے تھے، فخر کی داستانیں چھیڑتے تھے قبیلے کے بہادروں کی شجاعت اور جوانمردی کے قصے دہرائے جاتے تھے سپاہیوں کو غیرتمندی کا درس دیا جاتا تھا اور انہیں قبیلے کی عزت وناموس پر جان قربان کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔اور ان کاموں کے لیے میدان جنگ میں شعراء اور خطباء کو بھی ساتھ ساتھ رکھا جاتا تھا۔

عرب کی لسانی اور ثقافتی تاریخ میں ان جنگوں یا"ایام العرب" کی بے حد اہمیت ہے۔ان ایام کا زبان اور ادب کی ترقی اور اسے سنوارنے میں بڑا تعاون رہا ہے۔ان ایام کے سبب شاعر اور ادیب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔اگر کسی قبیلے میں کوئی اچھا شاعر ابھرتا تھا تو قبیلے والے اس خوشی میں دعوتوں کا اہتمام کرتے تھے۔

ان جنگوں میں اپنوں کی مدح اور غیروں کی ہجو کے لیے قریش کی زبان ہی استعمال ہوتی تھی جس سے اس زبان کو ترقی کے بہت مواقع حاصل ہوئے۔دراصل انہیں ’’ایام العرب‘‘ سے گزر کر قریش کی زبان عربی زبان بنی اور فصحیٰ کے مرتبے پر فائز ہوئی۔

قریش کی زبان میں قرآن کے نزول نے اسے ارتقاء کی آخری منزلوں سے ہمکنار کر دیا اور یہ زبان عربی زبان کا مترادف بن گئی۔عرب کی بولیوں پر قریش کی زبان کا غلبہ واقتدار تو پہلے سے قائم تھا لیکن قرآن نے اس غلبے کو دوام عطا کر کے اس زبان کو’’عربی مبین‘‘ بنا دیا۔

عربی زبان پر قرآن وحدیث کا اثر:

قرآن وحدیث نے اپنی فصاحت و بلاغت کے ذریعے عربی زبان کے تمام شعبوں کو متاثر کیا۔ چنانچہ اس زبان کے اغراض ومقاصد، الفاظ ومعانی اور افکار واسالیب سبھی پر قرآن وحدیث کے اثرات نمایاں اور ظاہر ہیں۔

قرآن وحدیث نے عربی زبان کے اغراض ومقاصد میں نئے نئے ابواب کا اضافہ کیا، اسے فنونِ کلام کے بے شمار طریقوں سے واقف کرایا اور عربی زبان کو ایسے موضوعات سے روشناس کرایا جن سے یہ زبان اب تک ناواقف تھی، مثلاً: قانون سازی، اصول قضا، سماجی اصلاح سیاسی نظام دینی عقائد، قصے، تاریخ، مسائل مابعد الطبیعات اور مظاہر فطرت کا مطالعہ وغیرہ۔

اسلام نے عربی زبان کو مختلف علوم وفنون سے بھی واقف کرایا جیسے: فقہ، کلام، منطق، فلسفہ، ریاضیات، طبیعات، فلکیات اور کیمیا وغیرہ۔ قرآن وحدیث کی فہم اور ان کے حفاظت کے لیے مسلمانوں نے نئے نئے عربی علوم ایجاد کئے، جیسے نحو، صرف، بلاغت تنقید، عروض، خط، املاء اور قرأت وغیرہ یہ سب قرآن وحدیث کا بالواسطہ اثر ہے۔

قرآن وحدیث کے اثر سے عربی زبان کے مقاصد وموضوعات میں وسعت بھی پیدا ہوئی اور تنوع بھی آیا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان معانی خیالات اور اسالیب کے اعتبار سے بھی وسیع اور متنوع ہوتی گئی۔

عربی زبان پر قرآن وحدیث کا ایک اثر یہ بھی پڑا کہ اس زبان کے بہت سے الفاظ نے اپنے قدیم معانی کھودیئے اور نئے معانی میں استعمال ہونے لگے۔ ایسے زیادہ تر الفاظ کا تعلق عبادت، مذہبی رسوم، سیاسی وتنظیمی امور اور علوم وفنون کی اصطلاحات سے ہے جیسے: الصلاۃ، الصوم، الزکاۃ، الحج، الخلیفہ، امیر المؤمنین، الوالی، الکاتب، الشرطہ، الوظیفہ اور دیوان الرسائل وغیرہ۔

عربی زبان پر قرآن وحدیث کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ اس کے بہت سے ایسے الفاظ متروک ہوگئے اور استعمال سے باہر ہوگئے جن کا تعلق عصر جاہلی کے ایسے نظام اور ایسی رسموں سے تھا جنہیں اسلام نے ختم کر دیا تھا، تو ان کے ساتھ ساتھ ان پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی ختم ہوگئے یا کم از کم غیر مستعمل ہوگئے۔ اسلام نے عہد جاہلی میں استعمال ہونے والے دنوں اور مہینوں کے ناموں کو بھی بدل دیا کیونکہ ان ناموں کا تعلق بعض جاہلی اور بت پرستانہ عادات ورسوم سے تھا۔

کتاب وسنت میں علم کی جو فضیلت آئی ہے اور اہل علم کے لیے جس اجر وثواب کا ذکر ہے اس نے عربی بولنے والوں میں طلب علم کا غیر معمولی جذبہ پیدا کر دیا اور وہ علوم وفنون کی تحصیل اور ان کے ترویج واشاعت میں لگ گئے اور دیکھتے دیکھتے عرب کے ریگستان علم وادب کے نخلستانوں میں تبدیل ہوگئے۔ اور ایک امی قوم تمام دنیا کی معلم بن گئی۔ عربوں میں علوم وفنون کے اس فروغ وانتشار نے عربی زبان کو بھی غیر معمولی ترقی دی۔ عربوں نے نہ صرف گزشتہ علوم میں اضافہ کیا بلکہ نئے نئے علوم کی ایجاد بھی کی جن سے عربی زبان بھی مالا مال ہوتی گئی۔

ہمارے ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ''تاریخ عالم کی جھلکیاں'' میں لکھا ہے کہ۔

''ایشیا و یورپ اور افریقہ میں عربوں کے پھیلاؤ اور ان کے ذریعے دنیا کو دی جانے والی ترقی یافتہ تہذیب وتمدن تاریخ کے عجائب میں سے ایک عجوبہ ہے۔''

عربی رسم الخط کا ارتقاء:

قدیم عربی زبان دو رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔مسند اور ثمودی۔خط مسند دراصل حِمیَر یا قدیم جنوبی عربی زبان کا رسم الخط تھا جو شمال کی عربی زبانوں میں بھی استعمال ہونے لگا تھا۔دھیرے دھیرے ثمودی خط کی جگہ نبطی خط استعمال ہونے لگا یہ رسم الخط نبطیوں نے اپنے پڑوسی آرامیوں سے سیکھا تھا اور یہ رسم الخط فینیقیوں کے ایجاد کردہ نظام تحریر پر مبنی تھا اور ایک عرصے تک قدیم شمالی عربی زبانوں کی تحریروں میں یہی دونوں یعنی مسند اور نبطی رسم الخط استعمال ہوتے رہے۔العربیہ البائدہ یا مٹ جانے والی عربی زبانوں کے جو نقوش دستیاب ہوئے ہیں وہ انہیں دونوں خطوں میں ہیں۔

کچھ عرصے کے لیے حیری (سلطنت حیرہ کی طرف منسوب) اور انباری رسم الخط بھی بعض قدیم شمالی عربی زبانوں میں استعمال ہوا ہے۔ان کے علاوہ بھی بعض رسم الخط تھے جنکا محدود پیمانے پر استعمال ہوا ہے۔لیکن اسلام آنے سے قبل عربی یا زبان مُضَر جس رسم الخط میں لکھی جاتی تھی وہ نبطی رسم الخط کی ترقی یافتہ شکل تھی۔اسی خط میں قرآن کی کتابت ہوئی اور اسی میں پیغمبر اسلام کے کاتبوں نے مختلف بادشاہوں کے نام ان کے خطوط لکھے۔

اسلام آنے کے بعد اس رسم الخط نے، جو اب عربی رسم الخط بن چکا تھا، بڑی ترقی کی۔ابوالاسود الدؤلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے عربی حروف پر نقطے لگائے۔اور خلیفہ عبدالملک (646-705ء) نے عاصم لیثی اور یحییٰ بن یعمر سے قرآن پر اعراب لگانے کے لیے کہا، کیونکہ بغیر اعراب کے قرآن پڑھنے میں عجمیوں کو بہت دشواری ہوتی تھی اور وہ کبھی کبھی غلط پڑھ جایا کرتے تھے۔ان دونوں عالموں نے اعراب کے اظہار کے لیے بھی نقطوں کا سہارا لیا۔حرف کے اوپر کا نقطہ فتحہ یا زبر کی علامت ہوتا تھا نیچے کا نقطہ کسرہ یا زیر کی علامت ہوتا تھا اور ضمہ یا پیش کے لیے حرف کے بائیں جانب نقطہ لگایا جاتا تھا۔لیکن یہ نقطے حروف کے اپنے لفظوں سے خلط ملط ہو جاتے تھے لہذا ان دونوں میں تمیز کے لیے دونوں قسم کے نقطوں کے لیے الگ الگ رنگ کی سیاہی استعمال کی گئی۔پھر کچھ عرصے بعد اعراب کے لیے مختصر ترچھے الف اور مختصر واو کا استعمال ہونے لگا زبر کے لیے یہ مختصر ترچھا الف حرف کے اوپر لگایا جاتا تھا اور زیر کے لیے نیچے، جبکہ پیش کے لیے مختصر واو کا استعمال ہوتا تھا جو حرف کے اوپر لکھا جاتا تھا۔

اس کے بعد عرب حکومتوں کی سرپرستی میں عربی رسم الخط میں بڑی ترقی ہوئی اور کچھ نئی علامتیں ایجاد ہوئیں جو اب تک استعمال ہو رہی ہیں عربی رسم الخط کی بہت سے قسمیں وجود میں آئیں اور اس میں بڑی مہارت اور فنکاری کا مظاہرہ کیا گیا چونکہ اسلام میں تصویر پر پابندی تھی لہذا مساجد اور محلات کے در و دیوار کو آراستہ کرنے کے لیے فنکارانہ تحریر سے ہی کام لیا گیا۔اس ضرورت نے عربی رسم الخط کو اس قدر متنوع بنا دیا جس کی کوئی مثال کسی زبان کے رسم الخط میں نہیں ملتی ہے۔

عربی علوم وفنون کا ارتقاء:

عربی زبان کی ہمہ جہتی ترقی کے نتیجے میں اس زبان کے علوم وفنون نے بھی خوب ترقی کی۔عربی نے اپنی زبان کی سلامتی و

حفاظت اوراسکی زیب وزینت کے لیے ایک طرف تو زبان کے قدیم فنون میں اضافے کئے اور دوسری طرف بہت سے نئے علوم وفنون بھی ایجاد کئے۔ان علوم وفنون میں سے اہم مندرجہ ذیل ہیں۔

1. نحو، 2. صرف، 3. معانی 4. بیان، 5. بدیع، 6. عروض، 7. قافیہ، 8. قرأت، 9. فقہ اللغہ، 10. انشاء 11. ادب، 12. شاعری، 13. محاضرہ وغیرہ۔

قرآن وحدیث کی افہام وتفہیم کی غرض سے مسلمانوں نے ان علوم کی ترقی اور تہذیب میں بہت کوششیں کیں۔ جب عربوں میں زبان کا صحیح ذوق اور سلیقہ کم ہوا اور بے شمار عجمی اقوام حظیرۂ اسلام میں داخل ہوئیں تو دونوں کو قرآن حدیث کی صحیح فہم کے لیے انہیں علوم پر بھروسہ کرنا پڑا اس چیز نے ان علوم وفنون کے لیے ترقی کے دروازے کھول دئے۔

ان علوم وفنون میں سرفہرست نحو وصرف ہیں۔ کہا جاتا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد کی روشنی میں ابوالاسود دؤلی نے عربی نحو کے ابتدائی قواعد وضع کئے پہلی صدی کے آخر تک صرف کے مسائل بھی نحو کے ضمن میں بیان کئے جاتے تھے پھر رفتہ رفتہ صرف علم نحو سے علاحدہ ہو کر ایک مستقل علم کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ اموی اور عباسی دور میں عربی زبان کے ان دونوں علوم نے کافی ترقی کی اور کوفۂ وبصرہ میں ان کے دو بڑے مرکز بن گئے۔ان دونوں مراکز کے علما میں بعض نحوی وصرفی مسائل میں اختلافات تھے جنہیں لیکر دونوں مراکز کے علماء میں خوب بحثیں اور مذاکرے ہوتے تھے جن کے سبب عربی نحو وصرف میں ایسا تنوع پیدا ہو گیا اور ان میں ایسی وسعت وگہرائی آگئی جس کی مثال دنیا کی کسی زبان کے قواعد میں نہیں ملتی ہے۔ بعد میں بغداد اور مصر کا شمار بھی عربی قواعد کے بڑے مراکز میں ہونے لگا۔

نحو وصرف کے بڑے علماء میں ابوالأسود الدؤلی، نصر بن عاصم، یحییٰ بن یعمر، اخفش، خلیل بن احمد، سیبویہ، ابوعلی فارسی، زَجّاج، کسائی، فرّاء اور ثعلب وغیرہ کا نام آتا ہے۔ اس کے بعد متاخرین کا دور آتا ہے جنہوں نے نحو وصرف کے مسائل کو ابواب میں تقسیم کر کے کتابوں میں جمع کیا اور ان دونوں فنون کی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سرفہرست، زمخشری، ابن حاجب، ابن معطی، ابن مالک، سکاکی اور ابن ہشام وغیرہ شامل ہیں۔

نحو وصرف کے ساتھ ساتھ لسانی اور لغوی مطالعات نے بھی خوب ترقی کی جسے قدماء فقہ اللغہ کہتے تھے۔ یہ فن فنون عربیہ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بعد میں اس فن نے ترقی کر کے علم لسانیات کی شکل اختیار کی۔

اس فن کے نمایاں علماء میں اصمعی، ابن فارسی، ابن جنّی، ابن سیدۃ، ثعالبی اور جوالیقی وغیرہ ہیں۔ متاخرین میں سیوطی، خفاجی اور احمد فارس شدیاق وغیرہ نے اپنی تحقیقات اور تصنیفات کے ذریعے اس فن کو بڑی ترقی دی۔

لغوی مطالعوں میں لغات اور معاجم بھی شامل ہیں، چونکہ عربی زبان اپنے مفردات کی کثرت اور تنوع کے اعتبار سے دنیا کی سب سے منفرد زبان ہے لہذا اس میں لغات کی ترتیب وتالیف کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔

عربی زبان میں لغات نویسی کا آغاز دوسری صدی ہجری سے ہی ہو گیا تھا۔ ابتداء میں مخصوص اشیاء سے متعلق الفاظ ومعانی کو

جمع کر کے کتاب کی شکل دی گئی، مثلاً ابوحاتم کی کتاب ''کتاب الازمنۃ'' ہے،اس میں مختلف زمانوں اوراوقات وغیرہ سے متعلق الفاظ کوجمع کیا گیاہے پھران کے معانی بیان کئے گئے ہیں۔

مشہورلغوی اصمعی نے بھی اس نوعیت کی بہت سی کتابیں لکھی ہیں: جیسے کتاب الابل، الخیل، والشاءاوراسماءالوحوش، والنبات والشجر والنخل والکرم وغیرہ۔عربوں نے لغت کی ایسی بے شمار کتابیں لکھیں، جو بعد میں باقاعدہ لغت نویسی کے لیے مواد کی حیثیت سے کام میں آئیں۔

عربی لغات کی دوسری قسم ''معاجم المعانی'' ہیں۔ان لغات کی ترتیب مختلف معانی کے اعتبار سے دی جاتی ہےاور پھران معانی کے اظہار کے لیے الفاظ ذکر کئے جاتے ہیں۔مثلاً اگرکوئی شخص ایک معنی کو جانتا ہےاوراس معنی کی ادائیگی کے لیے مناسب لفظ کو جاننا چاہتا ہےتو وہ اسے ان لغات میں تلاش کرسکتا ہے۔

ایسی لغات لکھنے واے علماء میں ابن سکیت، ھمذانی، ثعالبی اور ابن سیدۃ شامل ہیں۔عربی لغات کی تیسری قسم کو''معاجم الالفاظ'' کہا جاتا ہے۔اس میں الفاظ کومخصوص ترتیب میں رکھا جاتا ہے تاکہ کسی بھی لفظ تک پہنچنا آسان ہو پھران کے معنی ذکر کئے جاتے ہیں یہ قسم دوسری قسم کا عکس ہے۔اورہم لوگ آج اس قسم کی لغات کا استعمال کرتے۔اسم قسم کی پہلی لغت خلیل بن احمد (متوفی 174ھ) نے تیار کی تھی۔اوران کے اس لغت کی ترتیب مخارج کی بنیاد پر ہے۔یعنی جس حرف کی ادائیگی حلق کی جانب جتنے اندر سے ہوتی ہےاس کا ذکر اتنا ہی پہلے ہوتا ہے۔اس لغت کا نام کتاب العین تھا۔

بعد میں اس قسم کی لغات نے ترقی کی اورحروف ہجاء کے اعتبار سے مرتب ہونے لگے۔ان لغات میں مادے کا آخری حرف باب بنتا ہےاور پہلا حرف فصل، مثلاً ان لغات میں لفظ''عرب'' باب الباء کے فصل العین میں ملیگا اور یہ لفظ ''بشر'' کے بعد آئیگا۔

اوراسی قسم نے مزید ترقی کرکے لغات کی موجودہ شکل اختیار کی ہے۔جس میں الفاظ اپنے مادے کے حروف کی ترتیب کے اعتبار سے پائے جاتے ہیں۔

عربی زبان کے اہم لغات نویسوں میں: جوہری، احمد بن فارس، زمخشری ابن الاثیر، رضی الدین صغانی لاہوری، ابن منظور، فیروزابادی اورسید محمد مرتضی زبیدی بلگرامی وغیرہ شامل ہیں۔

نحو وصرف اورلغت کے بعد عربی علوم میں سب سے زیادہ اہمیت علوم بلاغت کو ہے۔ان میں معانی، بیان اور بدیع شامل ہیں۔علم معانی کا موضوع ہے کہ عربی اسلوب مقتضی حال کے مطابق کیسے ہواورانسان اپنی بات کو بلیغ انداز میں کیسے بیان کرے۔علم بیان کا مقصد یہ ہے کہ ایک ہی بات کوتشبیہ، مجاز اور کنایہ وغیرہ کے سہارے مختلف طریقوں سے کیسے ادا کیا جائے اورعلم بدیع میں ان لفظی اورمعنوی محسنات کا مطالعہ ہوتا ہےجن سے کلام کوزینت دی جاتی ہے۔

علوم بلاغت کومسلمانوں میں شروع ہی سے غیرمعمولی اہمیت حاصل تھی۔قرآن کریم بلاغت کا معجزہ بن کر آیا تھااور پورے عرب کو یہ چیلنج دیا تھا کہ اس جیسی کوئی فصیح وبلیغ کتاب بنالائیں لیکن قرآن کے اس چیلنج کو کسی نے قبول نہیں کیا۔قرآن کے اعجاز بیان کو

اپنوں اور پرایوں سبھی نے یکساں طور پر قبول کیا ہے۔ لہذا یہ علوم آغاز اسلام سے ہی علماء اور مصنفین کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔

علوم بلاغت کے ابتدائی مصنفین میں، ابوعبیدہ، جاحظ، ابن معتز اور قدامہ بن جعفر وغیرہ شامل ہیں۔ ابو ہلال عسکری نے سب سے پہلے بلاغت کے علوم کا تفصیل سے ذکر کیا اور متقدمین کی تمام بحثوں کو ترتیب کے ساتھ جمع کیا۔ عبدالقاہر جرجانی نے معانی اور بیان کو علاحدہ کیا اور دونوں پر الگ الگ کتابیں لکھیں دراصل جرجانی کے ہاتھوں ہی یہ دونوں علم اپنے کمال کو پہنچے۔ اس کے بعد سکاکی، خطیب قزوینی اور سعدالدین تفتازانی وغیرہ کا نام آتا ہے۔ جنہوں نے علوم بلاغت کی تہذیب و ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

علم عروض کا شمار بھی اہم عربی علوم میں ہوتا ہے اسے خلیل بن احمد نے ایجاد کیا اور شاعری کی پندرہ بحریں مقرر کیں، سولہویں بحر کا اضافہ اخفش نے کیا شاعری کی اہمیت اور بادشاہوں اور امراء کے درباروں میں اس کی قدر و قیمت کے پیش نظر علم عروض و قافیہ کی بھی خوب ترقی ہوئی اور ان دونوں پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ اور ان کتابوں پر بے شمار شروح و حواش بھی لکھے گئے۔

قرآن کریم کی اہمیت کے پیش نظر اس سے متعلق علم علم قرأت کی بھی خوب ترقی ہوئی اس علم میں قرآن پڑھنے کے مشہور و معروف طریقوں کا مطالعہ ہوتا ہے۔ ان کے قواعد اور سندوں سے بھی بحث ہوتی ہے اور اصوات اور ان کے مخارج وصفات وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ اس فن کو جدید لسانیات کے موضوع ''الاصوات الکلامیۃ'' (Phonetics) سے گہرا تعلق ہے۔ ان طریقوں میں سے سات زیادہ مشہور ہوئے مسلمانوں نے علم قرأت میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

انشاء، ادب، شاعری اور علم المحاضرہ وغیرہ دوسرے عربی علوم وفنون نے بھی علماء و امراء کی سرپرستی میں خوب ترقی کی۔ ان علوم پر عربوں کی نگارشات سے عربی کتب خانے بھرے پڑے ہیں۔ عربی علوم وفنون کی بے مثال ترقی کی عالمی ادب میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔

عربی زبان کے مصادر:

عربی زبان کے مصادر سے مراد وہ وسائل و ذرائع ہیں جن سے عربی زبان تشکیل پاتی ہے۔ جن کی روشنی میں ہم عربی زبان کی صحت وسقم کا فیصلہ کرتے ہیں، فصیح عربی کی شناخت اور معرفت میں جن پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور جو عربی زبان کے لیے معیار مانے جاتے ہیں۔ یہ وسائل اپنی تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مندرجہ ذیل ہیں۔

1. ادب جاہلی، 2. قرآن کریم، 3. حدیث شریف، 4. ادب اسلامی

ادب اسلامی میں وہی کلام مصدر و معیار کی حیثیت رکھتا ہے جو عربی روزمرہ کے موافق ہو اور بقیہ تینوں مصادر کے مخالف نہ ہو۔ علاوہ ازیں اس کلام کا تعلق شہروں میں دوسری صدی ہجری اور دیہاتوں میں چوتھی صدی ہجری کی نہایت تک ہو۔ ادب اسلامی میں اس کے بعد کا کلام مصدر نہیں مانا جاتا ہے۔ کیونکہ بعد کے عصور میں لوگوں کی زبانیں بگڑ گئی تھیں اور وہ قابل دلیل واستناد نہیں رہ گئی تھیں۔ چونکہ شہروں میں عجمیوں سے اختلاط جلدی ہوا لہذا وہاں صرف دوسری صدی ہجری کے اواخر تک کی زبان کو ہی معیاری مانا جاتا ہے۔

1. الأدب الجاہلی:

ادب جاہلی سے مراد اسلام سے پہلے کا عربی ادب ہے اس میں عربی شاعری، خطبات، حِکَم اور ضرب الامثال یعنی محاورے وغیرہ شامل ہیں یہ سارے نمونے قریش کی زبان میں ہیں اور اسلام کی آمد سے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو برس پہلے تک کے ہیں اور ان تمام نمونوں کی جمع وتدوین کا کام اسلام آنے کے بعد ہوا ہے اور اس سے پہلے یہ صرف زبانی طور پر ایک سے دوسرے تک منتقل ہو رہے تھے۔

بہت سے مستشرقین اور کچھ عرب علماء نے جاہلی ادب کے ان نمونوں کے بارے میں شک وشبہات کا اظہار کیا ہے لیکن ان حضرات کے یہ شبہات مبالغہ آمیز ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ جاہلی ادب کے نام سے جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ سو فیصد تحریف وتغیر اور حذف واضافے سے پاک نہیں ہے۔ تقریباً دو سو برس تک جس ادب کا دارومدار زبانی روایت پر رہا ہے ان میں بعض تبدیلیاں ہو جانا فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے بلکہ ان میں قصداً بھی بعض تحریفات ہوئی ہیں کیونکہ راویوں نے ان میں مشرکانہ افکار و رسوم پر مشتمل اشعار کو حذف کر دیا ہے۔ بعض نے اپنے قبیلے کی عظمت وشجاعت اور فیاضی و بہادری بیان کرنے والے قصائد کو جاہلی ادب کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ قدیم ادباء وناقدین ان تحریفات سے اچھی طرح واقف تھے۔

لیکن ان سب کی بنیاد پر پورے جاہلی ادب کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ تحریف محدود ہے اور دوسری طرف جو تھوڑا بہت الحاقی اور اضافی ہے وہ بھی ان لوگوں کا ہے جو عہد جاہلی سے بے حد قریب تھے اور جنہیں اس عہد کی زبان اور ادب پر پوری قدرت تھی لہذا ان کے ذریعہ کئے گئے اضافے بھی جاہلی ادب ہی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

عصر جاہلی کے نامو شعراء میں امرؤالقیس، زہیر ابن ابی سُلمی، نابغہ ذبیانی، لبید ابن ربیعہ، اعشی، عمر و بن کلثوم اور طرفہ وغیرہ ہیں۔

2. قرآن کریم:

عربی زبان کے مصادر میں قرآن سب سے معتبر اور مستند مصدر ہے۔ قدیم ہو یا جدید، عربی ہو یا مستشرق ہر ایک کا اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ قرآن کریم عربی زبان کی سب سے بڑی نمائندہ کتاب ہے جس کی روایت اور نقل کی صحت میں کسی قسم کا کوئی شبہہ نہیں ہے۔ قرآن کی تدوین عہد صدیقی میں ہوئی اور یہ عربی زبان کی سب سے پہلی مُدَوَّن کتاب ہے۔ قرآن فصیح عربی زبان کا سب سے سچا ترجمان ہے۔ اور ہر دور میں اسے فصحی کے لیے معیار سمجھا گیا ہے جس کی روشنی میں عربی زبان کی صحت وخوبی کو پرکھا جاتا ہے۔

ہر دور کے عربی خطیب ومصنف نے قرآنی اسالیب کی پیروی کی ہے اور اسکی تعبیرات سے اخذ واستفادہ کیا ہے۔

3. حدیث شریف:

یہاں حدیث سے ہماری مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وفرمودات ہیں۔ علماء کا اتفاق ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم "افصح العرب"، یعنی عربوں میں سب سے زیادہ فصیح ہیں، اس مضمون کی کئی روایتیں خود آپ سے مروی ہیں۔ آپ کے اقوال

پر مشتمل احادیث بھی عربی زبان کا ایک اہم مصدر ہیں۔

حدیث شریف سے استناد کولیکر علماء میں اختلاف ہے، یعنی اس موضوع کولیکر علماء میں اختلاف رائے ہے کہ حدیث شریف کو عربی زبان کے لئے سند اور مصدر مانا جائے یا نہ مانا جائے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی حدیثوں کی روایت لفظ بہ لفظ نہیں ہے اور انہیں راویوں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔لیکن اگر کسی حدیث کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی روایت آپ کے الفاظ ہی میں ہے تو وہ عربی زبان کے لئے معیار اور صحت کی دلیل ہے۔

4. ادب اسلامی:

ادب اسلامی بھی عربی زبان کا مصدر ہے جہاں سے عربی زبان لی جاتی ہے اور جسے سند بنایا جاتا ہے۔ادب اسلامی سے مراد وہ ادب ہے جو اسلام آنے کے بعد وجود میں آیا۔دراصل قرآن وحدیث بھی اسلامی ادب کا حصہ ہیں لیکن ان کے اپنی مخصوص اہمیت کے سبب دونوں کو مستقل مصدر کی حیثیت سے شمار کیا جاتا ہے۔علاوہ ازیں یہ دونوں معیار اور استنادی قدر و قیمت میں بھی بقیہ ادب اسلامی سے ممتاز ہیں۔

ادب اسلامی میں سب سے پہلے وہ شعرا اور ادباء آتے ہیں جنھوں نے عصر جاہلی اور عصر اسلامی دونوں کو پایا ہے اور انہیں مُخَضْرَم کہتے ہیں جیسے: حَسَّان بن ثابت، کعب ابن زہیر اور خنساء وغیرہ ان شعراء کے کلام کو بھی عہد جاہلی کے شعراء کی طرح معیاری اور مستندی مانا جاتا ہے۔اس کے بعد ان شعرا کا کلام آتا ہے جنہوں نے صرف اسلامی عصر کو پایا۔ یہ صدر اسلام کے شعرا ہیں۔ان میں عمر بن ربیعہ، کُثَیِّر ،ذی الرُّمَّہَ ،فرزدق اور جریر وغیرہ شامل ہیں۔

اسلامی ادب میں اس عہد کے خطبات بھی شامل ہیں۔اہم خطباء میں عمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، سحبان ابن وائل اور زیاد ابن ابیہ وغیرہ کا نام آتا ہے۔ان کے خطبات بھی عربی زبان کا اعلی نمونہ ہیں اور یہ اس زبان کے لیے مصدر اور سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خلاصہ:

عربی زبان سامی زبانوں میں سب سے بڑی اور اہم زبان ہے۔ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں کی مذہبی زبان ہونے کے سبب اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ زبان ایک شاندار ماضی رکھتی ہے۔اور اس وقت بھی سیاسی وجغرافیائی نقطہ نظر سے ایک امتیازی مقام کی حامل ہے۔اس زبان نے دنیا کی بہت سی زبانوں کو متاثر کیا ہماری اردو زبان ان میں سرفہرست ہے۔

عربی زبان سامی زبانوں کے جنوبی گروہ کے عربی مجموعے کے شمالی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔ چونکہ عربی کے سوا شمالی شاخ سے تمام زبانیں مٹ گئی ہیں لہذا اسے ''العربیۃ الباقیۃ'' بھی کہتے ہیں۔اسلام سے پہلے اسے زبان مُضَر کے نام سے بھی جانتے تھے۔

چونکہ عرب ایک امی قوم تھے اور عموما لکھنا نہیں جانتے تھے۔لہذا اس زبان کے زیادہ قدیم آثار دریافت نہیں ہوئے ہیں اس کے قدیم ترین نمونے بھی پانچویں صدی عیسوی یا اسلام سے ڈیڑھ سو برس سے زیادہ پہلے کے نہیں ہیں۔لہذا اس زبان کی پیدائش اور ابتدائی نشونما کے بارے میں کم جانا جاتا ہے۔البتہ اس زبان کے دستیاب نمونے چونکہ ادبی اعتبار سے بہت اعلی درجے کے ہیں لہذا

قیاس کیا جاتا ہے کہ اسلام کی آمد کے وقت اس زبان کی پیدائش کو کم از کم دو ہزار سال گزر چکے تھے۔

یہ زبان پانچویں صدی عیسوی سے قبل ہی مختلف لہجوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔اور شمالی شاخ کی دوسری زبانوں کے مٹنے کے بعد پوری شمال میں پھیل چکی تھی۔جبکہ جنوب جزیرہ یا یمن میں حمیر زبان کا بول بالا تھا۔

عربی کے قدیم دستیاب نمونوں کو جاہلی ادب کہا جاتا ہے اس میں منظوم کلام حکیمانہ اقوال،خطبات اور محاورے وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب نمونے قریش کے لہجے میں ہیں کیوں کہ سبھی بولیوں والے ادبی تعبیر کے لیے قریش کی بولی کو ہی استعمال کرتے تھے۔ قریش کی بولی کو یہ مقام مختلف اسباب سے حاصل ہوا جن میں زیادہ اہم دینی اور اقتصادی اسباب تھے۔قریش کی بولی یا لہجے میں قرآن بھی نازل ہوا اور اس نے ہمیشہ کے لیے اس بولی کو عربی مبین بنا دیا عربی کی دوسری بولیاں یا تو ختم ہو گئیں یا اسی میں ضم ہو گئیں۔

قرآن نے عربی کو بے حد متاثر کیا اس زبان کے اغراض و مقاصد اور افکار و اسالیب سبھی پر قرآن کے اثرات نمایاں ہیں۔ حدیث شریف نے بھی عربی پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔

اس زبان کے بنیادی مصادر چار ہیں۔ادب جاہلی،قرآن کریم،حدیث شریف اور ادب اسلامی،عربی زبان انہیں سے اخذ کی جاتی ہے۔اور اسکی صحت اور معیار کے لیے انہیں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

سوالات:

1. عربی زبان کا مختصر اور جامع تعارف کرائیے اور اسکی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
2. قریش کی بولی کو غلبہ ملنے کے اسباب کا جائزہ لیجیے۔
3. قریش کے لہجے کی ترقی میں کون کون سے عوامل کارفرما تھے،تفصیل سے لکھیے۔
4. عربی رسم الخط کے ارتقاء کا مرحلہ وار ذکر کیجیے۔
5. عربی علوم کسے کہتے ہیں،ان کے ارتقاء کا مختصر اجائزہ لیجیے۔
6. عربی زبان پر قرآن و حدیث کے اثرات کو بیان کیجیے۔
7. عربی زبان کے مصادر کا مفصل تعارف کرائیے۔